ترقی اور "انتشار عظیم"

پروفیسر عبدالقدیر سلیم ○

انیسویں اور بیسویں صدی کو "سائنس" کی صدی کہا گیا۔ اب' جب کہ بیسویں صدی بھی اختتام پذیر ہو گئی' اور اس کے ساتھ ہی ساری دنیا اکیسویں صدی--- اور اس کے ساتھ ہی الف ثالث میں داخل ہو چکی ہے (یا کم از کم اس کا عمومی طور پر دعویٰ کیا جا رہا ہے)' ہم ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں۔ سائنس کی "برکات" ریل' موٹر کار' بجلی اور اس سے چلنے والے آلات ریڈیو' ٹیلی فون' ٹی وی' بھاپ' بجلی اور گیس سے چلنے والی مشینیں اور کارخانے' ساری دنیا میں عام ہو گئے ہیں' اور اب ان میں کوئی عجوبہ اور حیرت نہیں رہی کہ یہ روز مرہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کے آخری چند سالوں میں اس روز افزوں ترقی میں ایک نیا عنصر بھی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے' جو بیسویں صدی کے نصف آخر کے شروع شروع میں شرماتا اور لجاتا ہوا ترقی یافتہ دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوا' اور اب نہ صرف وہاں اپنی گرفت مضبوط کر چکا ہے' بلکہ ساری دنیا کو اپنے مضبوط شکنجے میں جکڑ لینے کے لیے تیار ہے۔ امریکہ' یورپ اور معاشی طور پر آسودہ ممالک ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں' جسے "عہد اطلاع" (information age) اور "مابعد صنعت دور" (post-industrial era) کا نام دیا گیا ہے۔ مستقبل دان الون ٹوفلر نے اس پیش رفت کو "تیسری لہر" (third wave) کا نام دیا ہے (آلون ٹوفلر: The Third Wave' ۱۹۸۰)۔ بقول اس کے پہلی لہر نے انسان کو شکار اور غذا کی تلاش میں سرگرداں حیوان کے دائرے سے نکال کر کاشت کار کے درجے تک پہنچایا' جس میں اس نے زمینوں کو آباد کرنا اور بستیوں کو بسانا شروع کیا' اور خانہ بدوشی کی زندگی ختم کی۔ پھر دوسری پیش رفت زرعی معاشرے سے صنعتی معاشرے کی طرف ہوئی' جب کارخانے اور بڑے بڑے شہر وجود میں آئے اور مشینی دور نے رسل و رسائل میں انقلاب پیدا کر کے "صنعتی انقلاب" کی طرح ڈالی۔ اور اب ہم اس تیسری لہر کے شانے پر ہیں' جو ایک بالکل نئے معاشرے' نئی معاشرت اور نئے

○ وزٹنگ پروفیسر' انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن' کراچی

طرز فکر کو جنم دے رہی ہے۔

اس نئے معاشرے کے اشاریے "ترقی یافتہ" ملکوں میں واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ملک جو اپنی صنعتی ترقی کی انتہا کو چھو چکے ہیں (یا چھو رہے ہیں) ان میں معیشت' قومی پیداوار اور دولت کا دارومدار اشیا سازی کے بجائے اب "خدمات" کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ صنعتی معاشرے کے بجائے "اطلاعی معاشرہ" جنم لے رہا ہے' جس کا ایک عام محنت کش کسی فولاد سازی یا کارسازی کی صنعت کے بجائے کسی بینک' ریستوران' دفتر' جامعہ' تحقیق و ترقی کے ادارے' سوفٹ ویئر کی فرم' یا ابلاغ' اشغال اور تفریح کی کسی جہت میں مصروف کار نظر آتا ہے۔ جسمانی مشقت ("چکی کی مشقت") کی جگہ ذہنی مشقت (مشق ذہن و ذہانت) لیتی جا رہی ہے۔ وہ کام' جو پہلے مزدور اپنے ہاتھ پیروں سے کرتے تھے' اب مشینیں کرتی ہیں' اور فارغ مزدور ایک دوسری طرح کی مزدوری کرنے پر لگائے جا رہے ہیں--- "ذہنی مزدوری"۔ پھر ریڈیو' ٹی وی' ٹیلی فون' فیکس' ای۔میل' کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے عام ہو جانے سے اطلاعات کی جلد اور بہ سہولت ترسیل' آسان سے آسان تر ہوتی جا رہی ہے' اور اس کے ساتھ ہی قومی حدود اور مقامی ثقافتوں کی حد بندیاں شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہوتی جا رہی ہیں۔ سائنس اور فنیات کی یہ پیش رفت ایک نئے معاشرے میں دھکیلے دے رہی ہے' اور وہ ہے "اطلاعی معاشرہ"۔ گویا ایک بالکل نئی دنیا ظہور پذیر ہو رہی ہے' جس کے خدوخال سے ہمارے آبا و اجداد واقف نہ تھے' اور اس کا شعور ہمیں بھی رفتہ رفتہ ہی ہو رہا ہے۔

فرانسس فوکویاما' جو ایک جاپانی نژاد امریکی عالم عمرانیات ہے' دنیا کے اس بدلتے ہوئے موسم پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کی کئی تحریریں' جن میں "تاریخ کا خاتمہ اور آخری انسان (The End of History and the Last Man) ۱۹۹۲' اور "اعتماد: معاشرتی فضائل اور تخلیق خوش حالی" (Trust: Social Virtues and the Creation of Prosperity) ۱۹۹۵ سے اہل علم کی توجہ کا مرکز بن چکی ہیں' اور ان پر کافی گفتگو ہوئی ہے۔

حال ہی میں اس کی تازہ تصنیف "انتشار عظیم" (The Great Disruption)' شائع کردہ: پروفائل بکس' لندن ۱۹۹۹) نے ایک مرتبہ پھر سماجیات' سیاسیات' معاشیات اور بین الاقوامی تعلقات کے علما کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ جس اطلاعی معاشرے کی ہم بات کر رہے تھے' فوکویاما' خود بھی اس کے منصۂ وجود میں آنے سے کچھ پریشان محسوس ہوتا ہے' مگر وہ خود اعتماد بھی ہے۔ آیئے اس کے خیالات کو کچھ تھوڑی سی تفصیل سے دیکھیں۔

فوکویاما کے نزدیک "اطلاعی معاشرہ" دو ایسے رجحانات کا سبب بنتا ہے' جنھیں آج کے نام نہاد جمہوری دور میں لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں: آزادی اور مساوات۔ آج لوگوں کو آزادی ہے کہ ٹی وی یا کیبل کے

درجنوں چینلز میں سے جسے چاہے دیکھیں' انٹرنیٹ پر جس سے چاہیں پینگیں بڑھائیں' تفریح کے درجنوں ذرائع میں سے جس سے چاہیں لطف اندوز ہوں۔ ڈھیلے ڈھالے اخلاقی رویوں کے صدقے' من مانی کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کو تو چھوڑیئے' بچوں کے رویوں اور طرز زندگی پر بھی والدین کی قدغن بعض صورتوں میں غیر قانونی بن چکی ہے۔ کھانے' پہننے (یا نہ پہننے) کی پابندیاں بڑی حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے خیال میں عوام پر سے حکمرانوں کا اختیار کم ہو گیا ہے۔ بیوروکریسی کے سخت ضابطے ڈھیلے پڑتے جا رہے ہیں' اور فرد کے اختیار اور آزادی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قیدوبند' ممنوع و مباح' جائز و ناجائز کی بحثیں بے معنی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کا ادراک کچھ یوں ہے کہ جس طرح پرانی آئی بی ایم اور اے ٹی اینڈ ٹی جیسی بڑی دیوپیکر کارپوریشنوں کی جگہ چھوٹی کارپوریشنوں کو فروغ ہو رہا ہے' اسی طرح سوویت یونین اور مشرقی جرمنی جیسی سخت گیر اور مقتدر مطلق ریاستوں کے انہدام سے اب زیادہ جمہوری اور آزاد ریاستیں وجود میں آرہی ہیں' کیوں کہ سابقہ ریاستیں جو قصۂ پارینہ بن چکی ہیں اپنے شہریوں کے علم' شعور اور "آگاہی" کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

اس عہد اطلاع یا عہد آگاہی (information age) کا ظہور امریکہ میں نوے کے عشرے میں انٹرنیٹ کی شروعات کے ساتھ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن فوکویاما کے مطابق امریکہ میں عہد صنعت کے بجائے "عہد خدمت" (service) کا آغاز اس سے بہت پہلے ساٹھ کے عشرے ہی میں ہو چکا تھا۔ اسی عہد سے جرائم کی شرح اور سماجی انتشار کی کمیت اور کیفیت میں بھی قابل ذکر اضافہ شروع ہوا۔ دنیا کے متمول ترین خطوں (شمالی امریکہ' مغربی یورپ' جاپان) کے گنجان شہروں کے اندرونی علاقے عملاً ناقابل رہایش بنتے گئے۔ دو سو سال سے (صنعتی انقلاب کے آغاز سے) قرابت داری (جسے اسلامی اصطلاح میں ہم صلہ رحمی کہہ سکتے ہیں) اور سماجی نظم کا جو زوال شروع ہوا تھا' بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس کی ابتری اور تنزل کی رفتار حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی۔ بیشتر یورپی ممالک اور جاپان میں شرح پیدایش اس تیزی سے نیچے آئی ہے کہ اگر وہاں خاصی تعداد میں "مہاجرین" جا کر آباد نہ ہو گئے تو اگلی صدی میں یہ ملک تقریباً خالی ہو جائیں گے۔ خاصی تعداد میں لوگ شادیوں کے بغیر ہی گزارا کرنے لگے ہیں' بچوں کی پیدایش کی شرح کم اور طلاقوں کی شرح بڑھنے لگی ہے۔ امریکہ اور اسکنڈی نیویا کے ملکوں میں اب ہر تیسرا بچہ شادی کے بندھن سے آزاد ہی پیدا ہوتا ہے۔ قتل و غارت گری اور سماجی انتشار پر مستزاد اس گذشتہ نصف صدی میں یہ ہوا کہ عوام کا اداروں پر سے اعتماد اٹھتا چلا گیا۔ نصف صدی پیشتر امریکہ اور یورپ کے اکثر شہری اپنی حکومت' سرکاری اداروں اور نجی اداروں اور عام شہریوں پر بالعموم اعتماد کا اظہار کرتے تھے لیکن ۹۰ کے عشرے میں کم ہی لوگوں کو ایک دوسرے پر اور حکومتی اداروں پر اعتماد اور بھروسا رہ گیا۔ مستقل روابط اور دیرپا تعلقات میں قابل ذکر کمی دیکھنے میں آرہی ہے۔ بیشتر "ترقی یافتہ" صنعتی دنیا میں سماجی

اقدار اور عمومی صورت حال میں واضح زوال کے آثار صاف نظر آرہے ہیں۔

فوکویاما کہتا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہونے والی یہ تبدیلیاں تدریجی نہیں' بلکہ ڈرامائی انداز کی تھیں (اور ان کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے)' اور اگرچہ گذشتہ دو ڈھائی صدیوں سے صنعتی انقلاب کے بعد ہی سے سماجی اقدار میں شکست و ریخت کا عمل محسوس طور پر نظر آنے لگا تھا' تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں صنعتی ملکوں میں صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ٹوٹ پھوٹ کا یہ عمل اس تیزی کے ساتھ واقع ہوا کہ اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اقدار کی اس شکست و ریخت اور معاشرے کے اس انتشار کو وہ "انتشار عظیم" (The Great Disruption) کا نام دیتا ہے۔

یہ ڈھے جانے کا عمل اور انتشار ایک بھیانک اور تلخ حقیقت ہے۔ یہ سنہرے ماضی کی خواب ناک وادیوں میں گم ہو جانے کی خواہش نہیں' بلکہ ایک درشت اور کرب ناک حقیقت ہے' جسے شماریاتی طریق پر' بڑھتے ہوئے جرائم' بے پدر اولاد' کاروبار اور سیاست میں اخلاق اور اعتماد کے فقدان' تعلیمی مواقع کے زوال اور بے کار نوجوانوں کی بے مصرف فوج کے بڑھتے ہوئے اعداد کی روشنی میں ناپا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مغربی معاشروں میں یہ منفی سماجی رجحانات کیوں ظہور پذیر ہوئے' جب کہ شمالی امریکہ اور یورپ کے ممالک کی معیشتیں' عہد صنعت سے عہد اطلاع کی طرف حرکت کر رہی تھیں۔ کیا آنے والے عہد اطلاع اور ان منفی سماجی اقدار میں کوئی علت و معلول کا رشتہ دریافت کیا جا سکتا ہے؟ یا محض یہ ایک اتفاق ہے کہ مغربی معاشروں میں ڈھیلے پڑتے ہوئے معاشرتی بندھن اور اخلاقی اقدار کے زوال میں نمایاں رجحان ایک ایسے زمانے میں دیکھنے میں آرہے ہیں جب وہاں کی معیشتیں' صنعتی دور کے بعد "عہد اطلاع" میں داخل ہو رہی ہیں؟

فوکویاما اپنی اس تازہ تصنیف میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ واقعتاً ان دو مظاہر کے درمیان علت و معلول کے رشتے موجود ہیں۔ یہ رشتے اپنی نوعیت کے اعتبار سے فنیاتی' معاشی اور ثقافتی ہیں۔ کام اور معاشی مصروفیات کی ماہیت میں کچھ اس طرح کی تبدیلی آئی ہے کہ جسمانی محنت اور مشقت کی جگہ اب ذہنی محنت لیتی جا رہی ہے' اور اس کے نتیجے میں کروڑوں خواتین اپنے گھروں سے نکل کر معاش کے میدانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ نتیجتاً گھر اور خاندانی نظام' جو روایتی اقدار کے گہوارے ہوا کرتے ہیں' تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف طبی فنیات' بشمول مانع حمل ادویات اور دوسرے طریقوں نے' نیز معالجاتی وظائف نے شرح اموات کو کم کیا ہے' پیدائش کی شرح گھٹائی ہے' اور عمر کے طول میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے بھی لوگوں کی زندگی میں بچے پیدا کرنے اور خاندان کی تشکیل کے عمل کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ بچے' خاندان اور بڑا گھرانہ' جو پہلے بڑھاپے کا سہارا تصور ہوتے تھے' اب بے معنی بنتے جا رہے ہیں' کہ ان کی ضرورت

ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انفرادیت پسندی کے کلچر کو جو زبردست فروغ ہوا ہے' اس نے اتھارٹی کے سارے بندھنوں کو کمزور کر دیا ہے' اور ان علائق کو بے جان کر دیا ہے' جو خاندان' محلے' گاؤں اور شہراور پھرپوری پوری قوم کے شیرازے کو تھام کر رکھتے تھے۔ یہ انفرادیت' منڈی' بازار اور معمل میں تو مطلوب تھی' جہاں نت نئے تجربوں سے نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں' اختراع' ایجاد اور نشوونما کا کلچر پروان چڑھتا ہے' اور نئے راستوں کی طرف پیش رفت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ دھوپ سماجی اقدار کے معیارات مطلوب کی وادیوں میں داخل ہوئی' تو اس نے بڑی تباہی پھیلائی۔ اس طرح بقول عالم معاشیات جوزف شوم پیٹر (Schumpeter) فنیاتی ترقی سے منڈی میں جس "تخلیقی تخریب" (creative destruction) کا آغاز ہوا تھا' سماجی روابط اور اقدار کے میدان میں بھی اسی انداز کی تخریب و تباہی نمودار ہونے لگی (یہ اصطلاح اولاً شوم پیٹر نے Capitalism, Socialism and Democracy میں ۱۹۵۰ میں استعمال کی تھی)۔

مگر حال کا تجزیہ کرنے سے پہلے آیئے فوکویاما کے قدم بقدم ہم ماضی کے ان عوامل کا جائزہ لیتے ہیں' جو موجودہ صورت حال کے منطقی طور پر ذمہ دار ہیں۔

موجودہ فنیات (ٹکنالوجی) جو یورپ اور پھرپوری دنیا میں صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کی ذمہ دار ہے' اپنی جلو میں ایک معاشرتی اتھل پتھل کو بھی ساتھ لائی۔ اشیا اور دولت کی پیدایش کے نئے نئے طریقوں اور ایجادات و اختراعات کے نتیجے میں انسانی معاشرے میں جدیدیت کا ایک ایسا عمل شروع ہوا' جس کی رفتار تیز ہی ہوتی چلی جا رہی ہے' اور اس کے رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ دخانی انجنوں سے چلنے والی کلوں نے نئی صنعتوں کو جنم دیا' اور پارچہ بافی جیسی روایتی صنعتوں میں اور رسل و رسائل کے میدان میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ریل گاڑیاں' خشکی پر اور جہاز' سمندروں میں بڑی تعداد میں انسانوں اور اموال کو سہولت کے ساتھ طویل فاصلوں تک لے جانے لگے۔ برطانیہ' یورپ اور پھرامریکہ میں یہ انقلاب اتنی تیز رفتاری کے ساتھ پھیلا کہ اس سے نہ صرف ان علاقوں کی صورت بدل گئی' بلکہ جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچے' وہاں بھی تبدیلی کا عمل واضح طور پر محسوس ہونے لگا۔ مغربی دنیا میں زرعی معاشرے' سو سال سے بھی کم عرصے میں شہری صنعتی معاشروں میں تبدیل ہونے لگے' اور اس کے ساتھ ہی دیہی زرعی معاشرے کے طور طریقوں' عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو کارخانوں اور شہری زندگی کے آہنگ کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔

ایک زرعی معاشرہ (چاہے وہ یورپ ہی کا ہو)' چھوٹے دیہاتوں اور مختصر آبادیوں کے مجموعوں پر مشتمل

ہوتا ہے۔ ان آبادیوں میں افراد کا ایک دوسرے سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ معاشرے کے بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ اکثر لوگوں میں باہم رشتہ داریاں یا قبائلی تعلق ہوتا ہے، اور وہ ایک دوسرے سے ذاتی شناسائی رکھتے ہیں۔ افراد، ایک دوسرے کے ساتھ اپنے پیشہ ورانہ علائق، سماجی تعلقات اور تفریحات تک میں یوں باہم گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے پر لازماً انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ سارے رشتے، روایتی ہوتے ہیں، اور روایت ہی ان بستیوں کے رہنے والوں کو آپس میں جوڑ کر رکھتی ہے۔

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ان چھوٹی آبادیوں اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع ہوئی، اور نتیجے کے طور پر بڑے بڑے شہر وجود میں آئے، یعنی بڑی شہری صنعتی آبادیاں۔ سماجی تعلقات میں فرد اور فرد کا رشتہ ڈھیلا پڑتا چلا گیا، تعلقات رسمی ہوتے گئے، اور فرد، فرد کی بجائے "نظام" سے وابستہ ہو گیا۔

اب اس نئے نظام کی ایک خوبی یہ تو ضرور تھی کہ اس میں اخلاقی اقدار اور غیر رسمی رسم و رواج کی جگہ باقاعدہ قوانین اور ضابطوں نے لے لی۔ دیہی دہقانی معاشروں میں اکثر بڑے زمین دار اور سردار اپنی مرضی کو قانون بنا لیتے تھے۔ باپ اور بیٹے کا تعلق، افراد خاندان کا ایک دوسرے سے رشتہ یا آقا اور غلام (خادم) کا تعلق، ابدی اور دائمی ہوتا تھا۔ اگرچہ ان تعلقات کی نوعیت کوئی تحریری یا رسمی انداز میں بہت زیادہ متعین نہیں ہوتی تھی، تاہم یہ باقی رہنے والے رشتے تھے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں وجود میں آنے والے معاشرے میں رشتے "معاہدے" پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک مزدور اتنے گھنٹے کام کرے گا، یا اتنی مقدار میں اشیا پیدا کرے گا، اور اس کے بدلے میں اسے اتنی اجرت اور یہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔ قبل صنعتی (دیہی) معاشرے میں افراد کے درمیان علائق کی بنیاد، اخلاقی اقدار تھیں۔ صنعتی (شہری) معاشرے میں یہ علائق "قانون" اور "ضوابط" کی بنیاد پر قائم کیے گئے، جس میں حقوق و فرائض کو باقاعدہ طور پر واضح انداز میں تحریری شکل دے دی گئی اور اس طرح ذاتی تعلق کے بجائے "قانونی تعلق" نے لے لی۔ افراد کے درمیان اخلاقی رشتہ ختم ہوا تو ہر فرد آزاد تھا کہ قانونی معاہدے کے تحت جب تک چاہے دوسرے فرد سے تعلق رکھے، اور جب چاہے اسے خیرباد کہہ دے۔

زرعی دیہی معاشرے سے صنعتی شہری معاشرے کی طرف مغربی ملکوں کی یہ "پیش قدمی" بیسویں صدی کے وسط تک تقریباً مکمل ہو گئی تھی۔ مگر اس کے بعد امریکی معاشرے کی سیادت میں مغربی معاشرے ایک نئی جہت کی طرف بڑھنے لگے جسے ڈینیل بیل (Daniel Bell) نے مابعد صنعتی معاشرے (post industrial society) کا نام دیا ہے، اور اب کمپیوٹر اور برقیاتی اطلاعی فنیات کے عام رواج پا جانے سے جسے "اطلاعی معاشرہ" (information society) کہا جانے لگا ہے۔

صنعتی انقلاب سے اس "اطلاعی انقلاب" کی طرف انسانی معاشروں کی یہ زقند کیا اتنی ہی بڑی ہے،

جیسی زرعی معاشرے کی صنعتی انقلاب کی طرف تھی؟ اگر صورت حال یہی ہے' تو انسانی معاشرے کو اپنے نظام اقدار و اخلاق میں زبردست تبدیلیوں اور بڑے اتھل پتھل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

فوکویاما نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آج کی (مہذب!) جمہوری ریاستیں (جن کا سرخیل امریکہ ہے)' موجودہ فنیاتی اور معاشی تبدیلیوں کے جلو میں اپنا روایتی بندوبست باقی رکھ سکیں گی یا نہیں؟ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ مغربی دنیا نے غیر رسمی' غیر تحریری رسم و رواج اور اخلاقی اقدار کے بجائے ایک رسمی' تحریری قانون اور "ضابطے" کو رواج دے کر معاشرے کی بقا اور اسے بدنظمی اور انتشار سے بچانے کی سمت جو قدم اٹھایا ہے' جو "ادارے" قائم کر دیے ہیں' وہی اس کی تادیر سلامتی کے ضامن ہیں۔ ہر فرد اور گروہ کو معلوم ہے کہ قانون اس سے کیا تقاضا کرتا ہے' اور اسے کیا کرنا چاہیے' اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ قانون کی حکمرانی کو جنم دینا مغربی تہذیب کے سب سے زیادہ قابل فخر کارناموں میں سے ایک ہے" (ص ۱۱)۔ یہ بات صحیح ہے' مگر ساتھ ہی وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ "اگرچہ رسمی قانون اور مضبوط سیاسی اور معاشی ادارے نہایت اہم ہیں' تاہم وہ بذات خود ایک کامیاب جدید معاشرے کی ضمانت دینے کے لیے کافی نہیں" (ص ۱۱)۔

اسے اعتراف ہے کہ اگرچہ امریکہ کا آئین' چرچ اور ریاست کی تفریق پر اساس رکھتا ہے' تاہم امریکہ کے ابتدائی نو آبادکار' جن کی اکثریت برطانیہ سے آئی تھی' پروٹسٹنٹ کلچر کے زیر اثر تھے' جنھوں نے معاشرے کو رضاکارانہ بنیادوں پر قائم ہونے والی انجمنوں کے تحت استوار کیا' اور اس طرح ایک اجتماعی' جمہوری کلچر وجود میں آیا۔ اس کے برخلاف اسپین اور پرتگال میں شاہی اور لاطینی کیتھولک روایت کے تحت' ریاست اور چرچ کے مضبوط اداروں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور اس طرح آزاد جمہوری "رضاکار" اداروں کو فروغ نہ مل سکا۔

لیکن اب امریکہ اور دوسرے جمہوری ملکوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان رسمی قانونی اداروں کی ساخت میں کسی ایسی قوت جاذبہ کا فقدان ہے' جو انھیں نئی فنیاتی' معاشی اور سماجی تبدیلیوں کے دباؤ کے تحت شکست و ریخت سے بچا سکے۔ "حریت" "فرد کی آزادی" "انتخاب کا حق" "لبرل ڈیموکریسی" "آزاد معیشت"--- اور اس طرح کے رویوں میں خود خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ یہ رویے جہاں ایک طرف ثقافتی تنوع اور رنگا رنگی کی طرف لے جاتے ہیں' وہاں اخلاقی اور سماجی انتشار کے بیج بھی بوتے ہیں۔ "رواداری" بہت اچھی اخلاقی خوبی ہے' لیکن ایک جہت سے دیکھیں تو اسی رواداری کے راستے پر چلتے ہوئے اخلاقی اقدار کے انہدام' اباحیت اور معاشرتی افتراق و انتشار کی منزل بھی بہت دور نہیں رہتی۔ "ایک متحرک' فنیاتی طور پر جدت و اختراع کی حامل معیشت' لازماً مروجہ سماجی رشتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی' کہ یہ بات اس کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے" (ص ۱۲)۔ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ وہ سماجی اقدار' جو

ایک عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں، اور انھیں خوش اسلوبی سے پورا کرتی ہیں، نئی فنیات اور معیشت کے نئے تقاضوں کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتیں، اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ٹیلی وژن اور اس کے قبیلے کے دوسرے برقیاتی ذرائع ابلاغ و اطلاع نے معاشرے میں جس انتشار کا رجحان پیدا کیا ہے، ٹی وی کے اشتہار اور سیریل اس کے غماز ہیں۔ خطرناک کوہ پیمائیوں، کشتی رانیوں، کاروں کی دوڑ، جان جوکھوں کے کام، خطرات میں بے دھڑک کود پڑنے والے لوگوں کے کارنامے، جنھیں سب تحسین اور رشک کی نظر سے دیکھیں--- کون کرتے ہیں؟ فلاں سگریٹ پینے والے، فلاں چائے پینے والے، جو زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے ہیں۔ آپ کے لشلشاتے ہوئے بال، آپ کے چمک دار دانت آپ کی ترقی اور مقبولیت کے ضامن ہیں، ان کے لیے فلاں شیمپو اور فلاں ٹوتھ پیسٹ استعمال کیجیے۔ ایک امریکی ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی نے ۱۹۹۶ میں اٹلانٹا میں گرما کے اولمپیائی کھیلوں کے موقع پر مضبوط کسرتی جسم والے وہ کھلاڑی دکھائے، جو ایسے کارہاے نمایاں کر رہے ہیں، جو کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اونچی عمارتوں کی عمودی دیواروں پر چلتے ہیں، ایک فلک بوس عمارت سے دوسری عمارت کی چھت پر کودتے پھرتے ہیں، پہاڑوں کی چوٹیوں سے ہزاروں فٹ گہری وادیوں میں چھلانگ لگاتے ہیں، اور پھر اسکرین پر پیغام کیا آتا ہے؟ "No limits" (لاقیود)۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ان فوق البشر دیوتاؤں کے امیج سے یہ بات وابستہ کر دی جاتی ہے کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ نہیں، کوئی قیود نہیں۔ اگر آپ ان جیسا بننا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی ساری حدود و قیود کو توڑ دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ پیغام یہ ہے کہ پرانے ضابطے طاقت ور نئی نسل کے ہاتھوں ٹوٹ رہے ہیں۔

اس "بربادی" کی ذمہ دار وہ کمپنی ہے، جس نے اس اشتہار کی سرپرستی کی۔ ماقبل انٹرنیٹ پیغام رسانی کے ذرائع اور ٹیلی فونی اجارہ داریاں، ان کے قواعد و ضوابط ازکار رفتہ ہو چکے، بلکہ یہ نقصان دہ پابندیاں ہیں، ان سے چھٹکارا پاؤ۔ انسانی روح ان جکڑبندیوں کو توڑے بغیر آزاد نہیں ہو سکتی، اور اس کے لیے ہم سے مدد لو۔ دیوتاؤں کی طرح آزاد، ہر قانون سے بالا اور سدا خوش رہو۔ تم سے اوپر اور کوئی نہیں ہے۔

فوکویاما کہتا ہے کہ ان اشتہارات کے خالق، شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک نہایت قوی محرک پیدا کر رہے تھے: فرد کو ہر طرح کی گھٹن پیدا کرنے والی، غیر ضروری سماجی قیود و حدود سے آزاد ہونا چاہیے۔ مغرب میں ۱۹۶۰ کے عشرے سے شروع ہونے والے جنسی انقلاب، "حریت نسواں" کی تحریک، مرد اور عورت کے لیے ہم جنسی کی آزادی کی تحریک اسی "آزادی کے مرض" کی علامتیں ہیں، جن کا نعرہ ہے "لاقیود" (فوکویاما، The Great Disruption، ص ۱۳)۔

اگرچہ "لاقیود" کے نعرے کو دائیں اور بائیں، دونوں بازوؤں نے پوری طرح اپنایا، تاہم ان کی

دلچسپیاں مختلف تھیں۔ بائیں بازو والے "لائف اسٹائل" اور سماجی اقدار میں آزاد روی میں زیادہ دل چسپی رکھتے تھے، اور دائیں بازو والوں کی دل چسپی "آزاد معیشت" سے تھی۔ ہر ایک کو اپنی ملکیت رکھنے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ (امریکہ: ہر ایک کو آتشیں ہتھیار کی آزادی)۔ بے قید معیشت ہی مغرب کی لبرل معیشت (آزاد، بے قید معیشت) کی توأم بہن ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ہر ایک کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی منفعت کی فکر کرے۔ "زیادہ سے زیادہ نفع"۔ اس پر کسی قدغن اور پابندی کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ "مسابقت" اور "منافع" یہ دونوں الفاظ مغربی نظام کی روح قرار پائے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور ہی میں اس تغیر کو "فرد کی آزادی" سے تعبیر کیا گیا۔ انیسویں صدی میں مغربی دنیا میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جو تغیرات ہو رہے تھے، "جمہوریت، فرد کے حقوق اور حریت" کا جو غلغلہ وہاں تھا، مشرقی یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے وسیع خطے بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جمہوریت کی اس لہر کو سیموئیل ہنٹنگٹن نے "تیسری لہر" کا نام دیا (سیموئیل پی ہنٹنگٹن The Third Wave: Democratization in the Late Twentieth Century، ۱۹۹۱)۔ اور فوکویاما نے اپنی مشہور تصنیف میں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ارتقائے انسانی کے مراحل بس اب ختم ہو چکے ہیں، تاریخ کا اختتام ہو چکا، اور آخری انسان وجود میں آ چکا۔ اب کوئی منزل، سر کرنے کے لیے نہیں بچی۔ آزاد جمہوریت (لبرل ڈیموکریسی) اور منڈی کی معیشت (مارکیٹ اکانومی) انسانیت کی معراج ہیں (فوکویاما، The End of History and the Last Man، ۱۹۹۲)۔

مگر ۱۹۹۹ کی اس تازہ تصنیف میں اسے تشویش اس بات پر ہے کہ موجودہ جمہوری نظام، آزادی کے نتیجے میں حد سے متجاوز انفرادیت اور خود غرضانہ رویوں کی طرف لے جا رہا ہے، اور اس کے سب سے واضح مظاہر امریکہ میں نظر آتے ہیں، جو سب سے زیادہ "فرد دوست" جمہوریت ہے (ص ۱۰)۔ آزاد جمہوریت کے پیچھے منطق یہ تھی کہ مختلف النوع اور متضاد قسم کے نظریات اور اخلاقی رویوں میں سے حکومت کو کسی ایک کی پشت پناہی کرنا اور دوسرے کو دبانے کی کوشش کرنا، سیاسی اور سماجی آویزش کا باعث ہوگا، اور اس سے پرامن سیاسی ماحول پروان نہ چڑھ سکے گا۔ اخلاقی اقدار جو خیر اور شر کا تعین کریں، اور مذہب، جو درست اور نادرست، جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے، انھیں میدان سیاست سے الگ ہی رکھا جائے، کیوں کہ اس طرح ہم بہت سے جھگڑوں اور مناقشوں سے بچ سکیں گے ۔

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
(اکبر)

مذہب اور سیاست (چرچ اور اسٹیٹ) کو الگ رکھا جائے۔ ہر ایک کو اپنے مذہبی عقائد رکھنے اور خیر و شر کے تصورات (اپنے تک رکھنے) کی آزادی ہے' جب تک کہ دوسرے (اور ریاست) اس سے متاثر نہ ہوں۔ اس طرح "رواداری" کو معاشرے کی اعلیٰ ترین اخلاقی قدر کے طور پر پروان چڑھایا گیا۔

لیکن ایسا معاشرہ جس میں اخلاقی اقدار اور ان کے نتیجے میں ظہور پذیر رویوں میں کوئی اتفاق ہی نہ ہو' انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا علاج ریاستی قوانین اور ان کے ذریعے وجود میں آنے والے ان اداروں کے ذریعے کیا گیا' جن کی پابندی اور احترام ہر شہری کا فرض ہے' اور ان سے اغماض اور تجاوز کو جرم تصور کیا جائے گا۔

فوکویاما کے نزدیک اس طرح وجود میں آنے والے سیاسی نظام کے لیے یہ ضروری نہیں کہ لوگ فضائل اخلاق سے متصف ہوں (یعنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل ہوں)۔ بس اتنا کافی ہے کہ وہ اس قدر عقل و شعور ضرور رکھتے ہوں کہ یہ سوچیں کہ ہمیں اپنے مفاد میں قانون کی پابندی کرنی چاہیے' بصورت دیگر نقصان ہمارا ذاتی ہی ہو گا۔ اسی طرح منڈی کی معیشت والی سرمایہ داری نے' جو اس سیاسی آزاد روی کے قدم بہ قدم چل رہی ہے' دولت کی پیدایش اور تقسیم کے سلسلے میں یہ فلسفہ پیش کیا کہ ہمیں اپنے مفاد میں وہ پالیسی اختیار کرنا چاہیے جو اپنی غایت کے اعتبار سے سودمند ثابت ہو۔ یعنی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو فوراً ذبح کر دینے کے بجائے عرصۂ دراز تک اس سے فائدہ اٹھانا بہتر رہے گا (۱)۔

خود غرضی کی اس منطق سے وجود میں آنے والے معاشرے بہت پھلے پھولے' اور فوکویاما اپنی متعدد تحریروں میں انھی کو انسانیت کی آخری منزل قرار دیتا ہے۔ تاہم مغرب کے بعض دانش وروں نے بھی اس انفرادی آزادی کے کچھ ایسے مضمرات دیکھے ہیں جو تشویش ناک ہو سکتے تھے۔ کیا قانون شکنی ہی واحد قانون کے طور پر رہ گئی ہے؟

اخلاقی اقدار اور سماجی ضوابط کو فرد کی آزادی پر بے جا مسلط کردہ پابندی تصور کرنا درست نہ ہو گا۔ کسی بھی متوازن اور ہم آہنگ معاشرے کے لیے کچھ پابندیاں ضروری ہوتی ہیں' تاکہ اس کے افراد میں تعاون کی راہیں متعین ہو سکیں۔ معاشرے کے اس مشترک نظام اقدار کو آج کے بعض علماے سماجیات نے "سماجی سرمائے" (social capital) کا نام دیا ہے۔ "مادی سرمائے" (physical capital) جیسے زمین' عمارات' مشینیں اور "انسانی سرمائے" (human capital) یعنی مہارتیں' صلاحیتیں اور علم--- کی طرح یہ سماجی سرمایہ بھی دولت کی افزایش میں ایک اہم عامل ہے' اور قومی معیشت میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی معاشرے کے افراد کو باہم جوڑتا ہے' انھیں افتراق و انتشار سے بچاتا ہے' اور خاندان سے لے کر سیاسی مجالس تک میں ان کے اجماع اور باہمی افہام و تفہیم اور ابلاغ کا باعث ہوتا ہے۔ سماجی نیکیاں یا اخلاق فاضلہ

جیسے صدق و صفا، دیانت و امانت، امداد باہمی، ایفاے عہد، محض اس لیے مستحسن نہیں کہ یہ اخلاقی اقدار ہیں، ان کی خالص مادی قدر و قیمت بھی ہے، جسے سکوں کی تعداد میں ناپا جا سکتا ہے۔ ان اقدار کے حامل گروہ ایک دوسرے پر اعتماد اور تعاون کے ذریعے اپنے مشترکہ مقاصد آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس انفرادی آزادی، فرد کے حقوق اور انفرادیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کا نتیجہ اجتماع کے زوال کا باعث بنتا ہے۔ معاشرہ مشترکہ اقدار، اجتماعی ضمیر اور اجتماعی آرزوؤں، امنگوں اور مقاصد سے وجود میں آتا ہے۔ یہ مشترک اقدار اور مقاصد جتنے مضبوط ہوں گے، معاشرتی بندھن بھی اسی قدر مستحکم ہوں گے، اور افراد کے درمیان یک جہتی کا احساس بھی اتنا ہی گہرا اور مضبوط ہوگا۔ اب صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ مغربی معاشرے میں لوگ جب اجتماعی بندھنوں سے آزاد ہونے لگے، تو انھیں ایسے رشتوں کی تلاش ہوئی، جو انھیں جوڑ کر رکھیں۔ لیکن اس طرح کے اختیاری رشتے نہایت ناپایدار ثابت ہوئے۔ ماں باپ اور اولاد کا رشتہ، جس کے استحکام پر اسلام سب سے زیادہ زور دیتا ہے مغرب میں بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اسی طرح روایتی ازدواجی تعلق کے بجائے "ساتھ رہنے" کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، جس میں فریقین "آزاد" ہوتے ہیں کہ جب تک چاہیں ساتھ رہیں، اور جب چاہیں علاحدہ ہو جائیں (انتشار عظیم، ص ۴۱)۔ اسلام نے اگرچہ طلاق / خلع کے ذریعے ازدواجی تعلق کو ختم کر دینے کی اجازت دی ہے، تاہم اس اختیار کو انتہائی ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنے کے لیے کہا گیا ہے، اور طلاق کو جائز امور میں انتہائی ناپسندیدہ تصور کیا گیا ہے۔ مغرب میں یہ رشتہ بہت ہی کمزور ہو چکا ہے۔

اسی طرح اسلام ہم سائیگی کے تعلق کو نہایت مضبوط بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہم سائے کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید کی گئی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اسے وراثت میں شریک نہ بنا دیا جائے۔ گویا اس کے حقوق قریب قریب وہی ہیں، جو عزیزوں اور قرابت داروں کے ہیں۔ لیکن بڑے صنعتی معاشروں اور عظیم الجثہ شہروں کے ظہور میں آنے سے "ہم سائیگی" کا تصور فنا ہوتا جا رہا ہے۔ بڑے شہروں میں کوئی کسی کو نہیں جانتا، لوگوں کو پتا نہیں کہ ان کے آس پاس کون رہتے ہیں، کیا کام کرتے ہیں اور ان کے مسائل کیا ہیں۔ مشینی انداز کی زندگی، جس کا بیشتر حصہ کام کی جگہ پہنچنے اور پھر گھر واپس آنے میں صرف ہو جاتا ہے، آدمی کو اس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ اپنے محلے کے معاملات میں دل چسپی لے، اور محلہ داروں سے سماجی تعلقات استوار کرے۔ مغرب میں عبادت گاہوں میں حاضری بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ بہت سے چرچ "براے فروخت" ہیں، اور اس طرح یہ "مذہبی بندھن" جو ایک جگہ جمع ہونے والوں کے لیے باہمی رابطے اور استواریٔ تعلق کا باعث بن سکتا تھا، بہت کمزور پڑ چکا ہے۔

فوکویاما اعتراف کرتا ہے کہ وہ معاشرہ، جو پسند و اختیار کی انفرادی آزادی کو حرز جان بنائے ہوئے ہے،

اور اس کے لیے اقدار اور قواعد و ضوابط کو تج دینے' اجتماعی مفاد کو نظرانداز کر دینے اور اپنی ذات ہی کو محور بنا لینے کا رجحان رکھتا ہو' انتشار' بے ترتیبی اور علیحدگی پسندی کا شکار ہو جائے گا' اور مشترک مقاصد کے حصول اور ان کے لیے جدوجہد کا اہل نہیں رہے گا۔ وہ معاشرہ' جو اپنی فنیاتی اور تکنیکی اختراع اور تازہ کاری (technological innovation) میں "لاقیود" کا نعرہ لگاتا ہے' ذاتی رویوں کی بہت سی صورتوں میں ہرقیدوبند سے آزاد ہو جانے کا رجحان رکھتا ہے' اور اس کے نتیجے میں مآل کار جرائم میں اضافے' خاندان کی ٹوٹ پھوٹ' والدین کا اپنے بچوں کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو جانا' ہم سایوں کی باہمی بے اعتنائی اور عدم دل چسپی' اور شہریوں کا عوامی مسائل سے لاتعلق ہو جانا بھی وہ اثرات ہیں' جو واقع ہو کر رہتے ہیں (ایضاً' ص ۷)۔

امریکہ اور مغربی دنیا کے اس انتشار عظیم میں اس "سماجی سرمائے" کے انحطاط کا کس قدر دخل ہے' جس کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہیں؟

رابرٹ پٹنام کے خیال میں ۱۹۶۰ کی دہائی سے امریکہ میں اس سماجی سرمائے کا زبردست انحطاط واقع ہوا ہے۔ اور اگر صورت حال واقعی یہی ہے تو یہ انسانی افلاس یقیناً اسے تیزی سے زوال کی گہرائیوں میں پہنچا کر رہے گا' سوائے اس کے کہ اس کا بروقت مداوا کیا جا سکے۔

مروجہ عمرانیاتی طریق تحقیق کے مطابق فوکویاما نے سماجی سرمائے کے اس مسئلے کو بھی شماریاتی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی ہے۔ جرائم کی صورت حال کیا ہے؟ کیا فی الواقع خاندان ٹوٹ رہے ہیں؟ باہمی اعتماد میں کمی آئی ہے؟ ان سوالات کے جواب اثبات میں ہیں' اور ان کی تفصیلات یقیناً نہایت دل چسپ اور چشم کشا ہیں' خاص طور پر ان ملکوں (اور افراد) کے لیے جو مغرب' خصوصاً امریکہ کی "ترقی" سے خیرہ چشم ہیں' اور اسی کو اپنا مثالیہ اور ہدف بنائے ہوئے ہیں' اس کے محصلات تک پہنچنے کے لیے جدوجہد جن کی غایت بن چکی ہے۔

تاہم سماجی سرمائے کے اس انحطاط اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے اس زوال کو' جس کی طرف مغرب کشاں کشاں پوری انسانیت کو اپنی رہنمائی میں لے جا رہا ہے' فوکویاما انسانیت کا آخری مقدر تسلیم کر لینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سماجی اقدار کی تباہی کے بعد لازمی طور پر ان کی تعمیرنو کا ایک نیا سامان پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے اس کے آثار نظر بھی آ رہے ہیں۔ اس کے خیال میں ایسا ہونا لازمی بھی ہے۔ انسان' بنیادی طور پر ایک سماجی مخلوق ہے۔ انسانوں کی بنیادی جبلتیں اور محرکات انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں' اور اس کے لیے کچھ اخلاقی قواعد و ضوابط تشکیل دیں' جو انھیں باہم جوڑ کر رکھیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ انسان ایک عاقل مخلوق ہے' اور یہ اس کی عقل ہی ہے'

جو اسے اپنی نوع کے دوسرے افراد سے تعاون کے نت نئے طریقے سجھاتی اور بجھاتی ہے (ایضاً، ص ۲۷۹، ۲۸۲)۔ تاہم انسان کو اپنی نجات کے لیے اپنی عقل، فہم اور تجربات سے ماورا کسی اور مابعدالطبیعیاتی یا مذہبی ہدایت اور رہنمائی کی طرف دیکھنے اور رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔

دراصل موجودہ غالب مغربی فکر، جس کی اساس مادیت، لادینیت اور حواس و عقل کی غیر مشروط اطاعت، حصولِ مسرت اور نفع عاجل اور خود سے برتر کسی قوت کی نفی پر ہے، اپنی ان نام نہاد محکم بنیادوں سے ماورا کسی حقیقت کی قائل ہی نہیں۔ مذہب، اس کے نزدیک ہدایت وہمی کا نام ہے، اور اللہ، ایک وجود موہوم ہے۔ وہ اس کی طرف پیش قدمی کے لیے تیار نہیں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں، حضرت ابراہیمؑ کے برعکس وہ یہ ادعا کرتی ہے کہ میں نے اپنے آبا کا مذہب ترک کر دیا، اور اس سائنس، ٹکنالوجی اور ترقی کا مذہب اختیار کر لیا ہے، جو مجھے ایسے گلشن بے خار کی طرف لے جائے گا، جہاں نہ احتیاج ہے نہ خوف، نہ کوئی پابندی ہے نہ قدغن۔ مگر اس راستے کی یہ محض ایک ممکنہ / مفروضہ منزل ہے۔ دوسری ممکنہ منزل وہ ہے، جس کی طرف کچھ دوسرے اصحابِ فکر اشارہ کر رہے ہیں، یعنی ایسی اتھاہ گہرائی جس کی تاریکی اور عمق ہی سے جھرجھری آجاتی ہے۔ برطانوی جریدے اکانومسٹ کے ایک مضمون نگار نے "sui genocide" (اجتماعی خودکشی) کے عنوان سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ مآل ہے اس "تخلیقی تخریب" اور بربادی کا جو انسان خود پر مسلط کیے جا رہا ہے (اکانومسٹ، ۱۹ دسمبر ۱۹۹۸ء)۔

حواشی

۱۔ "سماجی سرمائے" کی اصطلاح پہلے پہل لیڈا جوڈسن ہنی فن (Lyda Judson Hanifan) نے ۱۹۱۶ میں دیہی مدارس کے اجتماعی مراکز کے لیے استعمال کی تھی۔ اس کے بعد کئی علماے عمرانیات نے مختلف انسانی گروہوں کے رویوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی۔ ایک مضبوط، باہم مربوط، قانون کا پابند معاشرہ، جس کے افراد ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے، ہمدرد اور وسیع معنوں میں ہم عقیدہ ہوں، ایک مہذب معاشرہ ہو گا۔ ان خصوصیات کے بغیر حقیقی جمہوریت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ایک مہذب جمہوری معاشرے کی تشکیل کے لیے بھی "سماجی سرمائے" کی وافر مقدار کی ضرورت ہو گی۔ کسی بھی ملک یا معاشرے کی ترقی کے لیے محض مادی وسائل کافی نہیں:

قوم کا سرمایہ اے صاحب نظر دولت و حشمت نہیں، نہ سیم و زر
دولت اس کی، اس کے بچے تندرست محنتی، فرماں بر و ہشیار و چست

(محمد اقبالؒ / محمد سلیم عبداللہ)۔